\ڈاکٹر بلال سہیل

اسسٹنٹ پروفیسر ,فیڈرل گورنمنٹ سرسیّد کالج راول پنڈی

’’جنّت کی تلاش‘‘ میں تہذیبی وفکری مباحث

Dr Bilal Sohail

Assistant Professor,F G Sir Syed College , Rawalpindi

The Cultural and Intellectual Discourse in "Jannat Ki Talash"

Despite the vast research by the critics on the Urdu Novel and Novelists, little has been written about Rahim Gul's multifaçade novel "Jannat Ki Talash". The main goals and objectives of this paper are introduction and explanation of cultural and intellectual discourses in this novel. It is important to note how character transformations that shape the content of the story make it a true picture of Pakistani society.In the research process main themes in the novels of the legendary novelist Paulo Coehlo have been discussed as Coehlo's work has great resemblance with this novel. Some gross mistakes committed by the Urdu critics about this novel have also been rectified in this research paper.

رحیم گل کا ناول ’’جنّت کی تلاش‘‘ ۱۹۸۱ء میں پہلی بار شائع ہوا۔ اُس سے پہلے رحیم گل کے پانچ ناول ’’تن تارارا‘‘ ۱۹۷۱ء، ’’پیاس کا دریا‘‘ ۱۹۷۳ء، ’’زہر کا دریا‘‘، ۱۹۷۶ء، ’’داستان چھوڑ آئے‘‘ ۱۹۷۷ء، ’’وہ اجنبی رہا‘‘ ۱۹۷۸ء شائع ہو چکے تھے۔ جب کہ ایک فینٹسی ناول ’’وادی گماں میں‘‘ ۱۹۸۴ء میں شایع ہوا۔ رحیم گل کے سات ناولوں میں سے چھے ناول کم زور تخلیقی تجربات کی ذیل میں آتے ہیں، جن پر مصنف کے فلمی پس منظر کی چھاپ نمایاں ہے، مگر ’’جنت کی تلاش‘‘ میں آنے والے تہذیبی اور فکری مباحث یقینی طور پر اِس لائق تھے کہ اُن پر بھرپور توجہ دی جاتی۔ پچھلے ۳۰ سالوں میں اُردو ناقدین نے اِس ناول کو بڑی حد تک نظر انداز کیا ہے۔ اگر کسی نے چند سطریں یا کوئی مضمون لکھا بھی ہے، تو اُس کی نوعیت عموماً سرسری یا رسمی رہی ہے۔ پاکستانی سماج، دُنیا اور اِس کے لوازمات کو کیسے دیکھتا ہے، زندگی کے قرائن کے تئیں پاکستانیوں کا کیا رویّہ ہے؟ اِس ناول میں اُس کے اظہار کی جونوع بہ نوع وضعیں سامنے آئی ہیں۔ وہ تہذیبی حوالے سے ’’جنت کی تلاش‘‘ کے سنجیدہ مطالعے کی مقتضی ہیں، کسی بھی کتاب کا عنوان ایک پڑھنے والے کے لیے عموماً پہلے تعارف اور پہلے تأثر کا باعث بنتا ہے۔ اِس فن

پارے کا عنوان ایک قاری کے لیے نہ صرف کشش اور معنویت رکھتا ہے، بل کہ موضوعی مواد اور مافیہ کی طرف بھی ایک اشارہ ہے۔ بعض اوقات کتاب کا انتساب بھی موضوعی مواد اور مافیہ کی تفہیم میں ایک کلید کا کام کرتا ہے۔ ''جنت کی تلاش'' کے مطالعے میں انتسابی عبارت ''انسانی عظمت کے نام!، جبر کی چکی چلتی رہی، مگر وہ سچ بولتا رہا، کسی منجمد سماج میں پیہم سچ بولنا، میں الیگز ینڈر سولژنیٹسن کو بیسویں صدی کا ضمیر کہتا ہوں۔'' یہ بہت ہی سنجیدہ اور غور طلب الفاظ ناول کے کسی بھی سنجیدہ قاری کو اپنی گرفت میں لے سکتے ہیں۔ انتسابی عبارت میں تین باتیں قابلِ غور ہیں: ا۔ قاری کہانی میں در آنے والے یاس انگیز اور مشکل مواقع سے یہ نتیجہ نہ نکالے کہ کہانی کار انسان کا منکر ہے ۲۔ حالات کیسے ہی مشکل کیوں نہ ہوں، الیگز اندر سولژے نیتسن ایسے اصیل ادیب سچ بولتے ہیں۔ ۳۔ مصنف کا نوبیل انعام دار ناول نگار الیگز اندر سولژے نیتسن کو بیسوی صدی کا ضمیر قرار دینا، سٹالن کی متشدّد پالیسیوں پر تنقید کرنے والے اِس غیر معمولی واقعیت نگار، انسان دوست، ترقی پسند اور روشن خیال رُوسی ادیب کو ۱۹۸۱ء تک اُردو دنیا میں بہت کم لوگ جانتے تھے۔ ۱۹۶۸ء میں اُن کا شاہ کار ناول ''کینسر وارڈ'' سامنے آیا، ۱۹۷۰ء میں اُنھیں نوبیل انعام ملا۔ رحیم گل کے اِس ناول میں کئی مقامات پر سولژے نیتسن کے سفاک واقعیت نگار اُسلوب کی جھلک نظر آتی ہے۔ بڑے تخلیقی تجربات کے محرکات کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہو جائے، تو اُس کے مافیہ اور موضوعی مواد کو سمجھنا آسان ہو جاتا ہے۔

یہ کثیر المعانی کہانی مان سہرہ کے ڈاک بنگلے سے شروع ہوتی ہے۔ کہانی کا راوی وسیم ایک پڑھا لکھا اور خوش حال نو جوان ہے۔ جو ڈاک بنگلے میں ٹھہرے ہوئے ایک اور نو جوان عاطف اور اُس کی چھوٹی بہن امتّل سے متعارف ہوتا ہے۔ امتل کو کہانی کا مرکزی کردار کہا جا سکتا ہے۔ اِس ناول کی تکنیک پاکستانی اُردو ناولوں سے خاصی مختلف رہی ہے۔ وسیم، عاطف اور امتل مان سہرہ سے پاکستان کے مختلف علاقوں میں جاتے ہیں۔ اِس دوران میں وہ جو کچھ دیکھتے ہیں، جو کچھ اُن پر بیتتی ہے، وہ جو کچھ سوچتے ہیں اور اُن کے درمیان جو بحث مباحثے ہوتے ہیں، وہ سب داخلی اضطراب، خارجی عوامل، انسانی مغائرت اور موانست کی مختلف سطحوں کی ایک دل چسپ کہانی کی صورت میں آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ مصنف اِس حقیقت سے بخوبی آگاہ معلوم ہوتا ہے کہ بیانیے کی ہیئت نہ ہونے سے موضوع کے اجزا بکھر جاتے ہیں۔

انسانی اُلجھنوں کے ساتھ ساتھ پاکستانی تہذیب کی مختلف جہات کی نقاشی کے لیے اِس ناول میں سفر نامے کی تکنیک اپنائی گئی ہے۔ جس میں ہسپانی، اطالوی اور برطانوی سیّاح، ڈپٹی کمشنر ذکی الدین، بلوچستانی سردار، خانہ بدوش گرہستن، خان زادہ تاج، اُس کی داشتہ کشور، سوات کا ڈاکٹر اور اُس کی بیوی سمیت کئی کردار کہانی کو تہہ دار اور خوب صورت بنانے کا سبب بنتے ہیں۔ اِس ناول کی بہت ہی اہم جہت پاکستانیت ہے۔ اُردو میں ایسے ناول بہت کم لکھے گئے ہیں، جن میں پاکستانی تہذیب کے خدوخال اتنی مہارت سے پیش کیے گئے ہوں۔ تہذیب سے مراد وہ موجدانہ اہلیت اور نفسیاتی توانائی ہے، جو انسانی کارکردگی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جسے سماجیات کے ماہر سر ایڈورڈ بی۔ ٹائلر نے سماجی طور پر حاصل شدہ علوم، قوانین، رسوم، اخلاق اور عادات سے تعبیر کیا ہے۔ اِس ناول میں پاکستان کے تہذیبی مظاہر وجود اپنے متحرک اور منفرد رُوپ میں اِس طرح سامنے آتے ہیں کہ اِس ایک کتاب کے مطالعے کی بنیاد پر کوئی بھی شخص پاکستان شناسی کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ کہانی میں حُبِ وطن کے اظہار کے لیے نعرے بازی کی بجائے جزئیات اور بیانیے کے حُسن سے مادرِ وطن کی واقعی خوب صورتی کا اثبات کیا گیا ہے۔ ''یہ ملک نہایت بھرپور ملک ہے اور صحیح معنوں میں اپنا الگ کلچر رکھتا ہے۔'' گو کہانی میں یہ بات ایک ہسپانی سیاح بتاتا ہے، مگر ناول نگار نے وطن کے حسن کو متن میں سچ ثابت کیا ہے۔

زیارت، سبی، کوئٹہ، چمن، ایبٹ آباد، اوگی، مان سہرہ، کاغان، سوات، قلعہ عبداللہ، مظفر آباد، کراچی، لاہور، گلگت، مردان، نوشہرہ سمیت کئی پاکستانی تہذیبی علامیے بیانیے میں مبہوت کر دینے والی تمثالوں کی طرح جڑے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ رحیم گل نے سادہ ترین مشاہدات کو بھی اِس خوبی سے فنی تجربوں میں ڈھالا ہے کہ تہذیبی تجربے منعکس ہونے لگتے ہیں۔

جھیل سیف الملوک پاکستان کا ایک معروف اور خوب صورت سیّاحتی مقام ہے، جس کا ذکر کئی کتابوں میں ملتا ہے، یہاں اُس کے حسن کو تین حوالوں سے سامنے لایا گیا ہے، پہلے امتل کا تاثر کچھ یوں نقل ہوا ہے:

''میرے منہ میں جو زبان ہے، اُس میں اتنی قدرت اور صلاحیت نہیں ہے کہ میری آنکھوں نے جو دیکھا ہے اور میرے دل نے جو محسوس کیا ہے، اُسے بیان کر سکے۔ ہاں میری آتما کو زبان مل جائے، تو شاید جھیل سیف الملوک کی سچائی بیان کرے۔''[۱]

امتل کے الفاظ سُن کر اطالوی سیّاح کہتا ہے:

''میں سمجھتا ہوں، اِس منظر کو سینے کے کسی گوشے میں چھپا کر رکھ لیا جائے اور ضرورت کے وقت گریبان چاک کر کے دیکھ لیا جائے۔ بس یہ ہی انسان کی ذمہ داری ہے۔''[۲]

پھر وسیم ایک ہسپانی سیّاح کا جھیل سیف الملوک کے بارے میں جملہ دہراتا ہے جس نے کہا تھا:

''خدا کا تصوّر کون بیان کر سکتا ہے۔''[۳]

وسیم کے عیش پسند دوست خان زادہ تاج کا اپنی داشتہ کے ضمن میں جھیل سیف الملوک اِن الفاظ ذکر میں کرنا:

''کشور نے جھیل سیف الملوک نہیں دیکھی تھی، اِس لیے چلے آئے، میرے لیے پنڈی، لاہور، کراچی اور جھیل سیف الملوک سب ایک جیسے مقام ہیں۔''[۴]

یہاں امتل، اطالوی سیاح اور ہسپانی سیاح کے ذریعے انسان کے ایسے نفیس اور ارفع انسانی زاویہ نظر کی عکاسی کرتے ہوئے ایک ہیچ نفسیاتی جہت کا ذکر صنعتِ تضاد کا لطف ہی پیدا نہیں کرتا، بل کہ ٹراؤٹ مچھلیوں اور سانپوں کے بیان سے یہ واضح کرتا ہے کہ زمان و مکاں سے سرسری، اضطراری یا لمحاتی تعلق کس طرح ایک حیوانی سطح اختیار کر لیتا ہے۔

ہوش مند فن کار صرف غیر مانوس اور غیر معمولی مواد سے ہی نہیں، بل کہ مانوس اور معمولی مشاہدات اور تجربات سے بھی ایف۔ آر۔ لیوس کی ناول پر عائد کردہ دونوں شرائط پوری کرتے ہوئے کہ ناول زندگی کے لیے نیاز مندانہ کشادگی بھی دکھار ہا ہو اور اُس میں نامیاتی ہیئت بھی ہو فن پارے کی صورت پذیری کا عمل مکمل کر لیتا ہے۔ مثلاً مصنف ایک جگہ ہمارے ملک کے بعض مہذب لوگوں کا ملمع یوں اتارتا ہے:

''آپ نے غور کیا ہے۔ بڑی بڑی پارٹیوں اور دعوتوں میں لوگ کھانے پر کس طرح پل پڑتے ہیں۔ ایسی چھینا جھپٹی کا مظاہرہ ہوتا ہے، جیسے یہ لوگ نصف صدی سے بھوکے ہوں۔ چہروں پر تناؤ، آنکھوں میں درندگی، گدھ جس طرح متعفن لاشوں کو نوچتے ہیں، وہی وحشت مہذّب انسان کے چہرے پر ہوتی ہے۔ یہ سب عجیب لگتا ہے۔ نفرت انگیز! پندرہ منٹ بعد جب اُن کے پیٹ بھر جاتے ہیں، تو پھر اُن کی طمانیت دیکھنے کے لائق ہوتی ہے۔ کوئی منہ

کھولے دانتوں سے گوشت کے ریزے نکال رہا ہے اور کوئی سینے پر ہاتھ رکھ کر ڈکاریں لے رہا ہوتا ہے۔ کوئی بھی یہ نہیں سوچتا کہ اُس کی بغل میں جو آدمی بیٹھا ہے، وہ اُس کی حرکتوں سے کس قدر مجبور اور بے زار ہے کہ اُس کی بے اعتنائی کی شکایت بھی نہیں کر سکتا۔ تو یہ ہے جناب ہمارا مہذّب انسان اور ہماری مادی ترقی کی انتہا۔ ایک وقت کی روٹی میں اُس کی فطرت ننگی ہو جاتی ہے اور سارا ملمّع اُتر جاتا ہے۔''۵

پاکستانی نصابِ تعلیم، صحافتی اور مذہبی تحریروں میں ہندوؤں کے بارے میں عام طور پر متعصّبانہ اور غیر حقیقت پسندانہ رویّہ اپنایا جاتا ہے۔ جس کا اثر ادب میں بھی نظر آتا ہے۔ رحیم گُل کے ہاں یہ آلودگی نہیں ملتی:

''بازار میں گھومتے ہوئے ہم نے دو چار آدمی ایسے بھی دیکھے، جن کے رنگ روپ میں پٹھانوں والی بات نہیں تھی۔ اُن کے لہجے میں بھی سختی کے بجائے نرمی تھی اور اُن کے چہروں پر ملاحت کے ساتھ ساتھ تابع دارانہ انداز اور تاثر تھا۔ اُن کا رویہ پٹھان دکان داروں کے مقابلے میں بالکل مختلف تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی انکشاف ہو گیا کہ اس طرح کے تمام دکان دار ہندو ہیں، جو قیامِ پاکستان کے بعد بھی بھارت منتقل نہیں ہوئے۔''۶

کہانی میں کسی صداقت کے اظہار سے پڑھنے والا محض کہانی کار کے تہذیبی و فکری احساس سے شناسا نہیں ہوتا، بل کہ یہ چیز اُس کے جذبات کو مرتعش بھی کرتی ہے، جو کہ کام یاب فن پارے کا تقاضا بھی ہے، کیوں کہ صحیح الحواس جذباتی اثرات کسی صداقت کے اظہار سے ہی نمو پاتے ہیں:

''قیامت آئی کہ آئی، ایک دن آئے گا دنیا کی بڑی طاقتیں اِس نتیجے پر پہنچ جائیں گی کہ ایشیا میں دو چار ہائیڈروجن بم گرانے ضروری ہیں۔ چالیس پچاس کروڑ آدمی مریں گے، تو سو سال تک جنگ کا خطرہ ٹل جائے گا اور قحط کا اندیشہ بھی کم ہو جائے گا۔ کم از کم ہم لوگوں کو قیامت کا زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ ایشیا اس بارے میں بہت خوش قسمت ثابت ہوگا۔'' ۷

ثروت مند اطالوی سیّاح، جو گوناگوں تجربات سے بہرہ یاب ہے، جسے مستنصر حسین تارڑ کے ناول ''راکھ'' کے بے مثل کردار کا لیا کا پیش رو کہا جا سکتا ہے، اُس کا انسان اور جنس کے حوالے سے پیش کردہ سفّاک تجزیہ بھی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے، جو بانو قدسیہ کے ناول ''راجہ گدھ'' میں ایک مختلف تناظر میں سامنے آتا ہے:

''ایک وقت آیا کہ واقعی میں سوچنے بیٹھ گیا کہ کیا انسان کو، انسان سے دُور رکھنے کا فرض سونپا گیا ہے۔ کتے، گدھے اور دوسرے بہت سے جانور، جنسیت میں اوّلیت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے لڑتے ہیں۔ انسان کی بے اعتمادی اور بے اعتدالی کا مہذبانہ جنسی رویہ، کہیں اُس زمرے میں تو نہیں آتا؟ ہاں شاید! کیوں کہ مجھے ایسا لگتا ہے کہ ہم نے اپنے سینوں میں بہت سے بھیڑیے پال رکھے ہیں۔ جو وقتاً فوقتاً باہر نکلتے رہتے ہیں اور چیرنا پھاڑنا شروع کر دیتے ہیں۔ اگر ہمارے اندر کتے ہوتے تو غنیمت ہوتے، کیوں کہ کتا بھوکا ہونے کے باوجود اپنے مالک کو نہیں کاٹتا، لیکن بھیڑیا بھوک میں سب کچھ کر گزرتا ہے۔ دراصل ہم جنسی بھیڑیے ہیں۔۸

ادب میں جب غیر معمولی طور پر حقیقی یا غیر حقیقی کردار سامنے آتے ہیں، تو ایک سنجیدہ قاری اُن کرداروں کی انتہائی حالتوں سے اندازہ لگا سکتا ہے کہ تخلیق کار زندگی کی کس جہت کی نشان دہی کرنا چاہتا ہے؟ امتل وسیم اور عاطف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے، جو نظریہ ترقی پیش کرتی ہے، وہ اِس عہد کے تلخ حقائق اور حکمت سے خالی نہیں: ''جنت کی تلاش'' میں امتل کا کردار فکری اعتبار سے ایک غیر معمولی کردار ہے۔ کٹھن میں غیر معمولی کردار سے مراد وہ کردار ہے جس کے وجود کی حقیقت کو جھٹلایا نہ جا سکے۔ اُس کی بھرپور نمایندگی کی وجہ سے اُسے نظر انداز کرنا ممکن نہ رہے۔ چاہے وہ کچھ کہے نہ کہے کچھ کرے یا نہ کرے۔ غیر معمولی کردار اپنی کاملیت کی بدولت بہ یک وقت حیرت اور سادگی کا تاثر دیتا ہے۔ اُس کی ذہنی یا جذباتی جہات کا اظہار پر شور نہیں ہوتا۔ وہ ایک ایسا خاموش اور لطیف احساس بنتا ہے کہ قاری کی توجہ اُس کی صفات سے کہیں زیادہ خود اُس پر مرکوز رہتی ہے، کیوں کہ وہ فن پارے کے موضوعی مواد اور مافیہ کو با معنی بنا رہا ہوتا ہے اور اُسے یہ اہمیت خاص صفات کی بنا پر نہیں، بل کہ اُس کے ہونے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہیں۔ وہ اہم اس لیے ہوتا ہے کہ قاری اُس کے توسط سے ایک حقیقی آدمی سے متعارف ہو رہا ہوتا ہے، اقدار کے ذاتی تعیّن، باغیانہ رویّے، سوالیہ ذہن اور روایتی فکری اسالیب سے انحراف کے سبب امتل اُردو فکشن کا ایک زندہ اور قابلِ توجہ کردار ہے:

> ''میرا تصوّر عجیب و غریب ہے۔ میں زندگی کو دوسرے لوگوں سے بہت مختلف دیکھتی ہوں۔''۹

میرزا ادیب نے امتل کے کردار کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''رحیم گل نے اُردو ادب کو بڑا عجیب و غریب کردار امتل کی صورت میں دیا ہے۔ وہ فلسفی نہیں ہے، مگر اس کی گفت گو شروع سے آخر تک فلسفیانہ ہوتی ہے۔''۱۰

امتل کے عمیق افسانوی کردار کو سمجھنے کے لیے اِس بات کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے کہ فکر، وہ ذہنی پیش رفت ہے جو شعور کے جمالیاتی مطلوب کو حاصل کرنے کے لیے کی جائے، زندگی کے مقاصد کو اچھی طرح سمجھتے ہوئے احتیاج، اشتہا اور آرزو کی تسکین کے لیے اختیار کیے جانے والا مناسب طریقہء کار بھی فکر کہلاتا ہے۔

رحیم گل کی سوانح، اِس ناول کا موضوعی مواد، تکنیک اور اُسلوب کا مطالعہ بعض حیرت انگیز مشابہتوں کی بنا پر بار بار جس ہنر مند کی یاد دلاتا ہے، وہ برازیل سے تعلق رکھنے والے پُرتگالی زبان کے بے مثل ناول نگار پاولو کوئیلو ہیں۔ پاولو کوئیلو اور رحیم گل اپنی با قاعدہ تعلیم مکمل نہیں کر پائے، دونوں شو بزنس سے گیت نگار، کہانی نویس، اداکار اور ہدایت کار کے طور پر وابستہ رہے ہیں۔ اِس کے علاوہ ان میں ایک قدرِ مشترک سفر پسندی بھی ہے، جس کا بھرپور اظہار اِن کی تخلیقات میں ملتا ہے۔ رحیم گل کی طرح پاولو کوئیلو کی ابتدائی تصنیف بھی ناکام ہوئی، پاولو کوئیلو کا تصنیفی سفر ۱۹۸۲ء میں Arquivos do Inferno (انگریزی ترجمہ Hell Archives) سے شروع ہوا۔ ۱۹۸۶ء میں O Manual Prático do Vampirismo کے نام سے دوسری کتاب چھپی۔ (انگریزی ترجمہ Practical Manual of Vampirism) اُسی سال پاولو کوئیلو نے، سان تیاگو جانے والی ایک قدیم شاہ راہ کے ساتھ ساتھ ایک یاترا کے طور پر دو ماہ میں ۵۰۰ میل لمبا فاصلہ پیدل طے کیا۔ جس کے اثرات اُن کی بعد میں آنے والی تصانیف میں بہت واضح ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں ہی ایک فلسفیانہ خود نوشت کے انداز میں اِس سفر کا ماجرا Santiago de Compostela انگریزی ترجمہ (The Pilgrimage) کے نام سے چھپا، جو زیادہ مقبول

نہیں ہوا۔جس کی وجہ سے۱۹۸۸ء میں برازیل کا ایک عام سا پبلشر پاولوکوئیلو کی چوتھی کتاب ''O alquimista''(انگریزی ترجمہ Alchemist) کی محض ۹۰۰ کاپیوں پر مشتمل واحد ایڈیشن شائع کرنے پر راضی ہو سکا۔سان تیاگو نامی ایک سادہ لوح ہسپینی گڈریے کے احوال پر مشتمل یہ مختصر سا ناول، جس میں وہ خزانہ کھوجتے کھوجتے خود شناسی کی منزل کو پہنچ جاتا ہے، پاولوکوئیلو کی تخلیقی کیمیا گری کا ایسا نادر اظہار ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔وہ بار بار ایک عظیم خزانے کا خواب دیکھتا ہے، جو ہزاروں میل دُور ایک مصری اہرام میں مدفون ہے۔دو سال بعد مصنف کی اگلی کتاب''Brida''کے شائع ہوتے ہوتے،''الکیمسٹ'' کی ساڑھے چھے کروڑ کاپیاں بِک چکی تھیں۔اِن سطور کے لکھتے سمے تک پچھلے ۲۵ سالوں میں پاولوکوئیلو کے بارہ ناولوں سمیت ۲۶ تصانیف کے دس کروڑ نسخے فروخت ہو چکے ہیں۔''الکیمسٹ'' کا اُردو سمیت دُنیا کی ۶۷ زبانوں میں ترجمہ شائع ہو چکا ہے۔جو دُنیا میں کسی بھی زندہ ادیب کی کسی بھی کتاب کے ترجموں کا سب سے بڑا ریکارڈ ہے۔''الکیمسٹ'' کو بہ یک وقت ۳۵ ملکوں میں سب سے زیادہ فروخت ہونے والی کتاب کا منفرد اعزاز بھی حاصل ہے۔''الکیمسٹ'' کے اُردو میں تین تراجم دست یاب ہیں۔اِس مقالے میں یہ تفصیلات درج کرنے کا مقصد اُردو کی ناخواندہ اور بے نیاز دنیا میں ہنرمند ناول نگاروں کے زیاں اور بے بسی کے المیے کو ظاہر کرنا بھی ہے۔وہ اہم سوالات، جو ایک کتاب دوست معاشرے میں ناول نگار کو کروڑوں آدمیوں سے متعارف کراتے ہیں، اُردو دُنیا میں اُن پر جائز توجہ نہیں دی جاتی، ورنہ رحیم گل سمیت کتنے ہی باصلاحیت فن کار یہاں موجود ہیں، جو معروف اور مستند عالمی ادیبوں کے ہاں ملنے والے مسائل سے ملتے جلتے قضیوں کی طرف اپنے اپنے ڈھب سے توجہ دلا رہے ہیں، مگر اُن کی طرف کوئی دھیان نہیں دیتا۔

پاولوکوئیلو کی تخلیقات میں کردار اپنے خوابوں کی پیروی کرتے اور امتل کی طرح خود کو تلاش کرتے نظر آتے ہیں۔امتل وسیم سے کہتی ہے میرے رویّے میں فرار ہے، آپ اِس سے خوف زدہ ہو گئے۔خود آپ اپنے آپ سے خوف زدہ نہیں تھے۔یہ المیہ ہے آپ کی سوچ کا مگر مجھے آپ کی یہ بات پسند آئی کہ زندگی ضائع کرنے کے لیے نہیں ہوتی۔ہاں، مر کر بھی کیا ملے گا، پھر زندہ رہنے میں کیا حرج ہے۔سانپ کو مارو، وہ بچ نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔شیر اور ہاتھی بھی موت کا سامنا نہیں کرتے، پھر انسان سے جینے کا حق کیوں چھینا جائے؟ وہ جب کہتی ہے کہ انسان کو عقل کے ساتھ نہیں وجدان کے ساتھ زندہ رہنا چاہیے۔جیسے پرندے ایک خاص عرفان اور وجدان کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔پروفیسر نجمہ سہیل کے حال ہی میں چھپنے والے بہت اہم ناول''اندھیرا ہونے سے کچھ پہلے''کے مرکزی کردار آفتاب کی محبوب شمی بھی اِسی سوچ کی حامل ہے۔رحیم گل نے وجدان پر جس طریقے سے زور دیا ہے، اِس پر بعض مشہور فلسفیوں کا خیال آتا ہے، مشہور فلسفی دیکارت، جو تشکیک کو ایک فکری عمل کہتا ہے۔جس کا خالق انسانی ذہن ہے۔دیکارت سے بہت پہلے امام غزالی بھی ایسے ہی طریقے کی نشان دی کر چکے ہیں، جس میں انسانی وجدان کے ذریعے وجودِ حقیقی تک پہنچنے کی بات کی گئی ہے۔آں ری برگساں کے ہاں بھی وجدان کی خاص اہمیت ہے۔مرزا غالبؔ نے کہا ہے: اپنی ہستی ہی سے ہو جو کچھ ہو۔۔۔ گر نہیں محبت، تو وحشت ہی سہی، اِس حوالے سے رحیم گل کا تصوّر وجودی طرزِ احساس کے بہت قریب ہے۔پاولوکوئیلو بھی اِسی بات پر مُصر ہیں کہ ہر آدمی کے پاس اپنا ایک خواب اور ایک ذاتی فکر ہوتی ہے، جسے وہ باطنی روشنی کا نام دیتے ہیں، آدمی کو اُس کی طرف متوجہ ہونا چاہیے۔پاولو کوئیلو کے انگریزی مترجمین نے اِس کے لیے Personal Legend) کی اصطلاح استعمال کی ہے۔پولوکوئیلو کے تئیں یہ کوئی ایسی شے ہے، جس کی انسان اپنے دل میں شدید آرزو رکھتا ہے یا یہ وہ

راستہ ہے، جس پر چلنے کا فیصلہ کرنے والے کا دل جذبے اور اُمنگ سے بھر جاتا ہے۔ یہ خوابوں تک پہنچنے کا راستہ بھی ہے۔ یہ اُس کے جینے کا جواز اور خودشناسی کا راستہ ہے۔ رحیم گل کے ہاں اِسے عرفان کہا گیا ہے۔

رحیم گل کے خیال میں انسانوں کے خواب اسلاف سے مختلف ہونے چاہئیں۔ پاولوکوئیلو کی یہ فکر، کہ لوگ کیا چاہتے ہیں، اِس سوچ سے چھٹکارا پا کر فرد اپنے نصب العین کے حصول کی کوشش کرنی چاہیے۔ امتل کے کردار کا خلاصہ معلوم ہوتی ہے۔ ''الکیمسٹ'' کا سان تیاگو جس طرح خزانے کی تلاش میں سرگرداں نظر آتا ہے، جو ایک نصب العین کی علامت ہے، اُسی طرح امتل اپنی جنت کی متلاشی ہے، سان تیاگو آخر کار دل کی آواز سننے کے لائق ہو جاتا ہے، اُس کا خواب، اُس کا ذاتی عقیدہ صرف اُس کی ذات تک محدود نہیں رہتا، اُسے اِس کائنات کی روح کا ایک حصہ معلوم ہوتا ہے۔ وہ خودشناسی کی منزل تک جا پہنچتا ہے، اُسی طرح امتل کو بھی کہانی کے آخر میں ایک نومولود بچے کو دیکھ کر اپنے بہت سے سوالوں کے جوابات مل جاتے ہیں اور اُس کی بے چین روح کو قرار آ جاتا ہے۔ امتل عام کرداروں سے جس طرح مختلف نظر آتی ہے، اِس پر پاولوکوئیلو کے ناول ''Veronika decide morrer'' مطبوعہ ۱۹۹۸ء (انگریزی ترجمہ Veronika Decides to Die) کا خیال آتا ہے۔ جس میں دوسروں کی نقل یا پیروی کی بجائے مختلف اور منفرد ہونے کا خطرہ مول لینے پر زور دیا گیا ہے۔ ویرونیکا کی طرح امتل کا بھی یہ کہنا ہے:

> ''میرا تصوّر عجیب وغریب ہے۔ میں زندگی کو دوسرے لوگوں سے بہت مختلف دیکھتی ہوں۔'' [۱۱]

پاولوکوئیلو کے نزدیک پاگل پن کا مطلب ہے، انسان کا ایسا نظر آنا جیسا وہ نہیں ہوتا اور نارمل ہونے کا مطلب ہے اپنے خیالات کے اظہار کی صلاحیت ہونا۔ ڈپٹی کمشنر ذکی الدین جب امتل سے کہتا ہے کہ آپ کے خیالات سُن کر مجھے تعجب ہوا تو اِس موقع پر امتل جو جواب دیتی ہے، وہ اُس کے خیالات کے اظہار کی صلاحیت کی تائید کرتا ہے:

> ''اِس لیے کہ میرے خیالات کتابی نہیں ہیں۔ مجھے آپ کی مسلّمہ قدروں سے بھی کچھ زیادہ اُنس نہیں ہے۔ میں فانی اور لافانی کی بھی قائل نہیں ہوں۔ موٹر کے انجن کو بھی تیار کرنے کا ایک فارمولا ہوتا ہے۔ آپ لوگوں نے کتابیں لکھ لکھ کر اور اُصول گھڑ گھڑ کر زندگی کو بھی ایک فارمولا بنا دیا ہے۔ میں انسانی روح کو فارمولوں کے حوالے نہیں کر سکتی۔'' [۱۲]

انسان برازیل کا رہنے والا ہو کہ پاکستان کا، اِس ٹکنولوجی کے عہد میں، جب دنیا ایک عالمی گاؤں کی شکل دھار رہی ہے، سوچنے والوں کے مسائل ایک سے معلوم دیتے ہیں:

> '' اگر میرے کردار میں تضاد ہے اور میں باقی لوگوں سے مختلف ہوں، تو اِس میں میرا کیا قصور ہے؟ میں نفرت اور محبت کی پیداوار ہوں۔ یہ ہی میری اصلیت ہے اور لوگوں کو میری یہ ہی صورت قبول کرنا پڑے گی۔'' [۱۳]

امتل کے محولہ بالا الفاظ اگر'' Veronika decide morre '' کا مافیہ کہلا سکتے ہیں، تو اِس فن پارے کے عنوان اور کہانی سے یاد آتا ہے کہ امتل نے بھی زندگی کے سپاٹ پن اور یکسانی سے تنگ آ کر خودکشی کی کوششیں کی تھی۔ امتل کی طرح ویرونیکا ایک نوجوان،

خوب صورت ،خوش حال،عزیز ،رشتے دار اور روزگار رکھنے والی انسان ہے،مگر اُسے سلو وانیا کے قدیم ،تاریخی اور تہذیبی شہر لیو بلا ہنا(Ljubljana) کی زندگی اور روزانہ کے ایک سے معمولات اِس قدر بے معنی نظر آتے ہیں کہ وہ نیند کی گولیاں کھا کر خود کو ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے، ویرونیکا کی یہ کیفیت امتل سے بہت مشابہ ہے، جو دوبار خودکشی کی کوشش کر چکی ہے۔ وسیم بھی امتل کی کچھ ایسی ہی تشخیص کرتا ہے: ''ایک سا دن، ایک سی رات اور ایک سی زندگی نے آپ کو مایوس کر دیا ہے۔''۱۴

ویرونیکا اِس کوشش میں ناکامی پر ایک ہفتے بعد خود کو ذہنی مریضوں کے ہسپتال میں دیکھتی ہے، جہاں اُسے بتایا جاتا ہے کہ نیند آور گولیوں سے اُس کا دل بُری طرح متاثر ہوا ہے اور وہ دُنیا میں محض پانچ دن کی مہمان ہے۔ ہسپتال میں اُس کی موجودگی تمام مریضوں کو متاثر کرتی ہے، جیسے امتل کے آس پاس دکھائی دینے والے کردار اُس سے متاثر نظر آتے ہیں۔ زندگی محض پانچ دنوں کا سودا ہے، یہ بات ویرونیکا کو بڑے منفرد انداز میں زندگی کی اہمیت کا احساس دلاتی ہے، یہاں وہ اپنے وجود اور زندگی کے تصوّرات پر غور کرتی ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اب اُس کے پاس کھونے کے لیے اور کچھ بھی نہیں، سو وہ بغیر کسی خطرے کے، جو چاہے، کر سکتی ہے۔ اب اُسے اِس بات کی کوئی پرواہ نہیں کہ لوگ کیا کہیں گے؟ اب چوں کہ وہ ذہنی مریض ہے، تو اُس پر کوئی تنقید نہیں کرے گا۔ یہاں وہ ایک ذہنی مریض ایدوارد سے محبت کرنے لگتی ہے۔ جو خیالات، جذبات اور افعال کے باہمی ربط سے محرومی کے سنگین عارضے میں گرفتار ہے۔ اب وہ ایسے تجربات سے گزرنے لگتی ہے، جن سے پہلے جھجکتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ پانچویں دن جو کہ اُس کی زندگی کا آخری دن تھا، ایدوارد کے ساتھ پاگل خانے سے فرار ہو جاتی ہے۔ اِس سے پہلے کہ ڈاکٹر اُسے بتاتا کہ وہ بالکل ٹھیک ہے، اُسے پانچ دن کی مہلت کی بات محض زندگی کی اہمیت واضح کرنے کے لیے کی گئی تھی۔ ویرونکا یہ جاننے کے باوجود کہ یہ اُس کا آخری دن ہے، اُسے بامعنی بنانے کے لیے پاگل خانے سے بھاگ جاتی ہے، جیسے امتل میں کہانی کے آخری حصے میں ایک کم سن ماں کی زچگی اور نومولود بچے کو دیکھ کر وجود کی معنویت کا احساس پھوٹتا ہے اور وہ نارمل زندگی کی طرف لوٹ آتی ہے اور وسیم کی محبت کا اعتبار کر لیتی ہے۔ گویا دونوں ناول نگار رجائیت کی طرف بھی لے جاتے ہیں اور فرد کو اندر کی آواز سننے کی ترغیب بھی دلاتے ہیں۔ اِس ناول میں جس طرح بار بار شعور پر طنز کیا جاتا ہے، اُس کی بہ تر تفہیم کے لیے پاولو کوئیلو کی فکر بہت ممد ثابت ہوتی ہے، جس میں اجتماعی جنون کو شعور کہا گیا ہے۔ پاولو کوئیلو نے اپنے ناول ''Onze Minutos'' مطبوعہ ۲۰۰۳ء (انگریزی ترجمہ Eleven Minutes) میں جس باریکی کے ساتھ جنسی اور بدنی مسائل کو سمجھنے اور سمجھانے کی کاوش کی ہے اور اِس فکر کی تردید کی ہے کہ دُنیا جنس کے مسئلے کے گرد گھومتی ہے۔ اُس پر امتل کے یہ الفاظ رہ رہ کر یاد آتے ہیں اور رحیم گل کی فنی گہرائی سے آگاہی ملتی ہے:

> ''جسم اُس وقت تک خوب صورت ہے جب تک ٹٹولا نہیں گیا۔ راز اُس وقت تک راز ہے، جب تک فاش نہیں ہوتا۔ آخر میں آدمی سوچنے لگ جاتا ہے کہ یہ خوشی، پارے کی سی تڑپ کیوں کھو بیٹھی ہے؟ یہ تھک کیوں جاتی ہے؟ پھر آدمی نتائج اخذ کرتا ہے کہ زندگی کی آخری خواہش یہ ہی تھی کیا۔ ایسی بھیانک انتہا! منزل پر پہنچ کر منزل کی جست جو! آخر کیا معنی؟'' ۱۵

پاولو کوئیلو کے ۲۰۰۶ء میں چھپنے والے ناول ''A bruxa de Portobello'' (انگریزی ترجمہ The Witch of Portobello) جو ایک پُراسرار خاتون اتھینا کی کہانی ہے۔ جس میں اپنے آپ سے مخلص رہنے کی

جرأت پیدا کرنے پر زور دیا گیا ہے۔اتھینا کا کردار بھی بعض حوالوں سے امتل سے مشابہت رکھتا ہے۔

کہانیاں وقوع پذیر نہیں ہوتیں، فن کاروں کو تخلیق کرنا پڑتی ہیں ۔اس کہانی میں امتل کا کردار مرکزی اور غیر معمولی ضرور ہے، مگر ناول نگار نے اِسے روایتی کرداری ناول نہیں بننے دیا۔ڈاکٹر سلیم اختر نے امتل اور ناول کو جس طریقے سے دیکھا ہے، وہ خاصا قابلِ اعتراض ہے:

''رحیم گل کی 'جنت کی تلاش' میں ایک ایسی جنسی Frigid عورت کا قصہ بیان کیا ہے، جو اپنی تلاش میں پھر رہی ہے، جب کہ ہیرو اُس کی تلاش میں ہے۔امتل کی یہ تلاش دراصل خود فرار بھی ہے۔ایسا فرار جو پاکستان کے خوب صورت مناظر کے پس منظر میں ہے۔جہاں تک کہانی کا تعلق ہے، تو یہ بنیادی طور پر مختصر افسانہ ہے، مگر رحیم گل کا کمال یہ ہے کہ اُس نے ایک وسیع کینوس پر اس کے نقوش اُبھارے ہیں۔'' [۱۶]

امتل کو Frigid یعنی جنسی طور پر سرد عورت کہنا، جو اپنی تلاش میں ہے، پھر اُس کے اپنے آپ کو تلاش کرنے کے عمل کو فرار خیال کرنا، وسیم جو ایک بیان کار ہے، اُسے ہیرو بنالینا، ایسے اسلوبِ تنقید کو تضاد آفرینی اور بسیار نویسی کی سزا کے سوا کیا کہا جائے؟ جس میں اپنی تلاش اور اپنی شناخت ایسے اہم ترین معاملے کو فرار کہا جارہا ہے، حال آں کہ شناخت اور فرار دو بالکل الگ الگ مسئلے ہیں، چار سو صفحات کو محیط، کثیر جہتی ناول کو مختصر افسانہ قرار دینا، لگے ہاتھوں ایک وسیع کینوس پر نقوش اُبھارے جانے پر مصنف کے کمال کا اعتراف بھی کر لینا۔اِسی کتاب میں صفحہ ۶۴۸ پر ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں کہ رحیم گل کی ''جنت کی تلاش'' پاکستان کے خوب صورت مناظر میں کہی گئی، ایک ایسی بے چین روح کی کہانی ہے، جو سفر کی صورت میں دراصل اپنی گم شدہ نسوانیت کی تلاش کر رہی ہے۔''بے چین روح کی کہانی'' یہ الفاظ تو سمجھ میں آتے ہیں، کیوں کہ خود مصنف نے استعمال کیے ہیں، البتہ ''سفر کی صورت میں دراصل اپنی گم شدہ نسوانیت کی تلاش'' یہ انکشافی بیان فاضل نقاد کا ہے۔یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر وہ واقعی اپنی نسوانیت کھو چکی ہے، تو پھر ''ہیرو اُس کی تلاش میں ہے۔'' کا کیا مطلب ہے؟ متن کو ذرا سا غور سے پڑھنے پر پتہ چلتا ہے کہ امتل ''Frigid'' ہے نہ ''اپنی گم شدہ نسوانیت'' کی متلاشی۔وہ خود وسیم سے کہتی ہے:

''تنہائی تو صرف خدا کو زیب دیتی ہے، وسیم صاحب! کہ مختارِ کل ہے اور کسی بھی شکل میں رہنے پر قادر ہے۔ہم جو اپنے آپ کو تنہا محسوس کرتے ہیں، تو یہ ہماری طاقت نہیں، بل کہ اِس کا احساس ہوتے ہی ہماری دکھوں کی کہانی شروع ہو جاتی ہے۔میں یا کوئی دوسرا اپنی مرضی یا خوشی سے تنہائی کے غار کی طرف نہیں بڑھتا، بل کہ دوسرے انسانوں کا برتاو ہمارے اندر ردِّ عمل پیدا کرتا ہے اور یوں ہماری بدنصیبی کا آغاز ہوتا ہے، اگر دُنیا میں آپ جیسے، سلطانہ جیسے، وزیر خان کے سارے کنبے جیسے لوگوں سے واسطہ پڑتا رہے، تو زندگی سے تلخی کا نام ونشان مٹ جائے اور یہ ہی نہیں انسان کے ساتھ تو جنس جیسی ضرورت لگی ہوئی ہے، فطرت نے اُسے ایک ہم سفر، ایک ہم نشیں کی احتیاج سے وابستہ کر دیا ہے۔'' [۱۷]

میاں بیوی کی عدم مطابقت سے اولاد کی شخصیت پر جو تباہ کُن اثرات مرتب ہوتے ہیں۔''جنّت کی تلاش'' کے بعد پروفیسر نجمہ سہیل کے ناول ''اندھیرا ہونے سے کچھ پہلے'' میں انھیں زیادہ وضاحت کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔''جنت کی تلاش'' میں ان چبھتے ہوئے سوالوں کو زبان دینے کی کوشش کی گئی ہے۔وہاں امتل کے ذریعے اعلیٰ سماجی اور نفسیاتی تحقیق کا موضوع بننے کے قابل اِس طرح کی غیر معمولی

فکر بھی سامنے آتی ہے:

''وہ اولاد جو قلبی واردات کی بجائے، مادی حادثے کی پیداوار ہو، اچھے سماج کی ضامن کس طرح بن سکتی ہے؟'' ۱۸

وسیم جب امتل سے پوچھتا ہے کہ یہ خود آگہی کیا چیز ہے؟ تو اِس پر امتل کی طرف سے دیے جانے والے جواب میں، خود اُس کی شخصیت کی گھمبیرتا اور بحران دونوں کا سراغ ملتا ہے ''دراصل یہ زندگی آپ کے لیے نہیں، اُن کے لیے عذاب ہے، جو سوچتے ہیں کہ اگر ایسا ہے تو ویسا کیوں نہیں؟ اِس طرح ہے تو اُس طرح کیوں نہیں؟'' ۱۹

امتل کا اصل قضیہ جنس یا ناجنس نہیں، اُس کے فکری مسائل ہیں، جن سے اُلجھتے ہوئے، وہ کبھی انسانوں سے مایوس ہوتی ہے، کبھی کائنات سے بیزار ہوتی ہے، دو بار تو خودکشی کی کوشش بھی کرتی ہے۔ اُس کے فکری مسائل خود ساختہ نہیں، ماحول پرداختہ ہیں۔ جارحیت اور مدافعت سے نفور امتل، ہی نہیں، شاید ہر سوچنے سمجھنے والے حساس اور باشعور پاکستانی کو ایسے مسائل کا سامنا ہے۔ امتل وجود کے احساس اور اس کی معنویت کی یاد دہانی کراتی ہے تا کہ انسان اشیا اور مادی سرگرمیوں میں گھر کر بے حس نہ ہو۔ یہ انسان شناسی اور زیست فہمی کی بلند سطحوں تک لے جانے والا کردار ہے۔ یہ ہی وہ کردار ہے، جو کہانی کو ایک معنی خیز انسانی تجربے کی شکل دیتا ہے۔ معانی حقائق کے معروضی عمل سے تعلق رکھتے ہیں، ہر صورتِ واقعہ کے معانی اپنے ماحولی تناظر سے مربوط ہوتے ہیں۔ کسی واقعے کا اُس کے طبعی تناظر سے لسانی سیاق وسباق میں منتقل ہونا ہی لسانی تشکیل کہلاتا ہے۔ واقعات کے طبعی تناظر اور اُن کے لسانی سیاق وسباق کے باہمی تعامل سے معنی آفرینی کا عمل مکمل ہوتا ہے۔ جو ایک تہذیبی فعل ہے، جس سے مقصدیت، وضع آفرینی اور انسانی معنویت کے اظہار کی مختلف حالتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ اِس ناول کے عمیق تجربے قاری کو باور کراتے ہیں کہ انسان اور تہذیب لازم وملزوم ہیں۔ تہذیب انسان کے بامقصد تخلیقی اظہار اور حسنِ تخیل کی طرف لے جانے والا فعل ہے۔ ہر وہ فعل جو اپنی اصلیت، ماخذ اور شناخت کی بنا پر انسانی نوعیت کا حامل ہوتا ہے تہذیب کی دلالت کرتا ہے۔ زمان ومکاں سے سرسری، اضطراری یا لمحاتی تعلق ایک حیوانی سطح ہوتی ہے، جب کہ طویل وابستگی، ایفائے عہد، پیشگی منصوبہ بندی اور نقشہ سازی ایسے اوصاف انسانی تجربے کہلاتے ہیں۔ اِن اوصاف کی موجودگی انسانی نوعیت کو کلی حیثیت میں دیکھنے پر اصرار کرتی ہے۔ جو زیرِ مطالعہ ناول کی ایک اہم جہت ہے۔ جس میں تہذیب اور فکر کو مربوط انسانی اعمال کے طور پر دیکھا گیا ہے۔

آشوبِ آگہی کے بوجھ سے گھبرا کر ردِّ حقیقت سے عرفان کی توقع کوئی نئی بات نہیں۔ دانش مندوں کے ہاں اِس رویّے کی کئی صورتیں ملتی ہیں، بابا بُلھے شاہ کہہ چکے ہیں، علموں بس کریں او یار، اکو الف ترے درکار، میر تقی میر کے یہاں تحصیلِ علم کرنے سے پایا نہ کچھ اصول۔۔۔ میں نے کتابیں رکھیں اُٹھا گھر کے طاق میں، کی صورت میں یہ احساس ملتا ہے۔ پھر پروفیسر لن یوتانگ کی فکر اور رُوسی ناول نگار گنچاروف کا مشہورِ عالم کردار اوبلوموف ایک طرح سے آگہی اور روایتی دُنیاوی معیارات سے دست برداری اور حقیقت کے غیر روایتی تصوّرات کی طرف توجہ دلانے کی ایک کاوش ہی تو ہے۔

وسیم جب امتل سے اپنا مدّعا اِس طرح کے لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ میں الفاظ کا نہیں آدمی کا پیچھا کرتا ہوں۔ الفاظ نتائج سے عاری ہوتے ہیں، لیکن آدمی اور آدمی کا سامنا بے نتیجہ نہیں ہوسکتا، بلبل کی چہکار کو آپ لفظ نہیں کہیں گی، پپیہے کی پی پی کو

آپ راگ کہیں گی، روگ نہیں، یہ چھکار زندگی ہے اور یہ راگ زندگی کا راگ ہے، کیا اِس سطح پر آدمی آدمی سے نہیں مل سکتا؟

''کیوں نہیں ـ ـ ـ ـ یہ حیوانی سطح ہے، افزایشِ نسل کا ایک بہانہ، اُس کے لیے دلائل اور وسائل ڈھونڈنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم اصل میں تو یہی ہیں۔'' ۲۰

ریاست ایک کلی حقیقت کے طور پر انسانی اعمال کے بڑے منطقوں کو منظّم کرنے کا باعث ہوتی ہے۔ تخلیقی اعمال اُس کے دائرہء اختیار سے باہر ہوتے ہوئے بھی اُس سے اثر لیتے ہیں۔ اِس کی ایک بڑی معنی خیز مثال اُس وقت فراہم ہوتی ہے جب اِس ناول کے کردار بلوچستان میں افغانستان کی سرحد کے قریب واقع ویش نامی گاؤں پہنچتے ہیں، وہاں انسانی حوالے سے ایک بڑی کرب ناک صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ کیوں کہ اِس گاؤں کے باشندوں کی شہریت کا اُصول انوکھا اور منفرد تھا۔ جن گھروں کے دروازے پاکستان کی طرف کھلتے تھے، وہ پاکستانی شہری تھے اور جن کے دروازے افغانستان کی طرف کھلتے تھے، وہ افغان شہری تھے۔ مثلاً ایک باپ کے دو بیٹوں کے گھروں کے دروازے اگر مختلف سمت میں تھے تو دونوں بھائی دو مختلف ملکوں کے شہری بن گئے تھے۔ اِس گاؤں کے لوگوں کی زبان، صورت، تہذیب اور روایات ایک جیسی تھیں، لیکن یہ دو الگ الگ ملکوں کے شہری ہو چکے تھے اور اُن کی وفاداریاں اپنے اپنے ملک کے ساتھ تھیں۔ یہ زمین پر انسانی ہاتھ سے کھینچی گئی تقدیر کی لکیروں پر ایک طنز بھی ہے اور ریاست کی حقیقت کو سمجھنے کی ایک کوشش بھی۔

پاکستانی تہذیب میں مذہب اور سیاست گفت گو کے لیے پسندیدہ ترین موضوعات خیال کیا جاتے ہیں، بے شک متکلم اِن موضوعات کی الف بے سے بھی واقف نہ ہو۔ اِس ناپسندیدہ روش کا اثر پاکستانی کہانیوں میں بھی نظر آتا ہے، مگر ''جنت کی تلاش'' میں جہاں بہت سارے موضوعات کہانی میں زیرِ بحث آتے ہیں، وہاں مذہب اور سیاست پر بحث برائے بحث کی بجائے مختصر ترین لفظوں میں مافی الضمیر بیان کرنے کی ایک مستحسن کوشش ملتی ہے، جس کی وجہ سے یہ ناول عمومیت کا شکار نہیں ہوتا۔ اگر کہیں مذہب یا سیاست کی بات آ پڑتی ہے، تو کردار ایک چابک دست مصوّر کی طرح ہلکے سے اشارے سے بڑی بڑی حقیقتیں آشکار کر جاتے ہیں، جیسے کہانی کے تینوں کردار جب مظفر آباد کے قریب پہنچتے ہیں، تو امتل کہتی ہے:

''کیا اچھا ہوتا! سری نگر بھی ہمارے پاس ہوتا! جھیل ڈل دیکھنے کا مجھے کتنا شوق ہے!'' اِس موقع پر عاطف کا جواب سیاسی طنز کا ایک مؤثر اظہار ثابت ہوتا ہے، جس میں ایوب دور کی تمام تر حماقتیں بھی بے نقاب ہو گئی ہیں۔

''امن کے نام پر ہم نے ہمیشہ نقصان اُٹھایا۔ سیز فائر نہ ہوتا تو سری نگر ہمارا تھا۔'' ۲۱

البتہ یہاں امتل سیاست سے بیزاری کی جو باتیں کرتی ہے، وہ بالکل درست ہونے کے باوصف کتابی معلوم ہوتی ہیں:

دوسری عالمی جنگ میں جاپان پر امریکا کے ایٹم بم گرائے جانے کے حوالے سے یہ امتل کا یہ کہنا :

''اٹیم بم نے پلک جھپکتے میں ناگاساکی اور ہیروشیما سے لاکھوں آدمی صفحہ ہستی سے مٹا دیے، لیکن جنگ تو بند ہو گئی۔ اِس لیے بم امن قائم رکھنے کے لیے بے حد اہم پہلو رکھتا ہے۔'' ۲۲

۱۹۷۷ء میں لکھے جانے والے اِس ناول کی مندرجہ بالا پیش بینی اور پنہاں ساز (Ironic) جہت کی اور کوئی داد دے یا نہ دے اردن دھتی رائے ضرور اسے سراہیں گی۔ دو غریب اور نیم خواندہ پڑوسی ریاستیں امن قائم رکھنے کے لیے ایک دوسرے کی آبادیوں کو تاک

کر جس طرح ایٹمی اسلحہ لیے چاک و چوبند نظر آ رہی ہیں، جہاں ایٹمی دھماکوں پر مٹھائیاں تقسیم ہوتی ہوں، ایسے ماحول میں یہ سمجھانا بھی تو آسان نہیں کہ ''بم امن قائم رکھنے کے لیے بے حد اہم پہلو رکھتا ہے۔'' درحقیقت ایک نعل وارونہ (Irony) ہے۔ جس کی کئی لطیف مثالیں اِس ناول میں ملتی ہیں جیسے ڈپٹی کمشنر اور اُس کا سستی شہرت کا شائق بلوچستانی سردار، جسے ڈپٹی کمشنر دوستوں کے سامنے ایک تفریحی آئٹم کے طور متعارف کرواتا ہے، جسے ایک دشوار پہاڑی کو پہلی بار سر کر کے اور اُس پر پاکستانی جھنڈا لہرا کر نام کمانے کی سوجھی تھی۔ آئرنی یہ نہیں کہ ناخواندہ بلوچستانی سردار اِس بات سے ناواقف تھا کہ اُس پہاڑ پر لوگ دوسری طرف سے آتے جاتے رہتے ہیں، یا یہ کہ پاکستان میں نام کمانے کے ایسے ہی طریقے موزوں ہیں، آئرنی تو یہ ہے کہ سی۔ ایس پی۔ ڈپٹی کمشنر جس نے اُسے پہاڑ سر کرنے کی اجازت لے دی تھی، اُسے اور متعلقہ محکمے کو بھی یہ نہیں پتہ تھا کہ لوگ دوسری طرف سے آتے جاتے رہتے ہیں۔

''جنت کی تلاش'' کے ایسے فنی اور فکری خصائص دیکھتے ہوئے، پروفیسر احسان اکبر کی یہ رائے نامنصفانہ اور مہمل معلوم ہوتی ہے:

''معاشرتی احوال کی تصویر اور صورتِ احوال پر تبصرہ اِس کی نمایاں پہچان ہیں،
مگر ناول کا نیا لہجہ سامنے نہیں آتا۔''۲۳

کہانی میں پروفیسر صاحب کو معاشرتی احوال کی تصویر بھی نظر آتی ہے، صورتِ احوال پر تبصرے کی بھی تائید کر رہے ہیں، بل کہ اُسے نمایاں پہچان قرار دے رہے ہیں، پھر نئے لہجے کے سامنے نہ آنے کا شکوا خیالِ ناقد فی بطنِ ناقد ہو کر رہ جاتا ہے، کیا لہجہ موضوعی مواد اور نقطۂ نظر سے ماورا بھی کوئی چیز ہوتی ہے؟

پروفیسر ڈاکٹر احسان اکبر کی طرح پروفیسر ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف نے بھی ''جنّت کی تلاش'' پر تبصرہ کرتے ہوئے عجیب آرا دی ہیں۔ کبھی تو وہ کہتے ہیں:

''جنّت کی تلاش ناول سے زیادہ کچھ اور ہے۔ زندگی، موت، سیاست، معاشرت، انسان، فطرت اور انسانی جذبوں کے بارے میں ناول نگار نے تصوّرات کا مکالمہ ہے۔ چند کرداروں کے حوالے سے رحیم گل نے زندگی کے متضاد تجربات کو کرداروں کی بحث کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اور کبھی کہتے ہیں۔

''دراصل رحیم گُل ناول لکھنا ہی نہ چاہتے تھے۔ اپنی سیاحت کے تجربات اور اُن تجربات کے ذریعے حاصل کردہ
معلومات معلومات ہم تک پہنچانا چاہتے تھے۔''۲۴

محولہ بالا مضمون کا عنوان ''جنّت کی تلاش۔ یا نئی نسل کا کرائسس'' دیکھ کر قاری امید کرتا ہے کہ فاضل نقاد اِس ناول کے مباحث کو تہذیبی یا فکری حوالے سے کسی منطقی نتیجے پر پہنچائیں گے۔ ''راجہ گدھ'' کے ذکر پر تقابلی مطالعے کا خوش کُن امکان پیدا ہو جاتا ہے، مگر یہاں تو صورتِ حال اُردو تنقید کا ''کرائسس'' بن جاتی ہے:

انسانی وجود کی حقیقت اور اُس کے تجرباتی اظہار کے درمیان جو ایک فاصلہ ہے، جس کی ایک تخلیق کار کے نزدیک بڑی اہمیت ہوتی ہے، جنت کی تلاش'' میں جس کے اظہار کی کئی صورتیں ملتی ہیں، اُس کی طرف اِس ناول کے ناقدین دھیان نہیں دے پائے، غیر انسانی ذی حیات کو ناقابلِ تبدل حیثیت کی بنا پر مشاہدہ اور استدلال کی مدد سے جانا جا سکتا ہے، مگر انسانی فطرت کے تئیں ایسا کوئی حکم نہیں لگایا جا سکتا۔ اِس

ناول کا بیانیہ اِس حقیقت کو باور کرانے کی ایک کوشش ہے۔

فرد کی ذات کی تکمیل کو انسانی شخصیت کی اساسی ساخت کہا جا سکتا ہے، جس کا خارجی ملزوم افراد کا ایک آفاقی رشتے کو محیط انسانی سماج ہے۔ جو بنی نوع انسان سے محبت کا احساس دلاتا ہے۔ انسانیت سے محبت کسی خیالی انسانی اجتماعیت کے لیے محبت کا مبہم احساس نہیں، بل کہ جیسے بھی ممکن ہو، جتنا بھی ممکن ہو، مشترک انسانیت کے تناظر میں ہر اُس آدمی سے، جس سے ہمارا کوئی نہ کوئی رشتہ ناطہ پیدا ہو جائے، اُسے ملحوظ رکھنا ہے۔ انسان کے لیے مکمل آزادی زندگی کا سب بڑا انعام ہوتی ہے اور یہ آزادی صرف اپنے ساتھ جڑے ہوئے افراد کی آزادی کی صورت میں حاصل کی جا سکتی ہے اور ہم میں سے ہر ایک کی آزادی دوسروں کی آزادی پر انحصار کرتی ہے۔ اِسی سے معاشرہ تشکیل پاتا ہے۔ جس میں افراد ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں۔ آدمیوں کے مل جل کر رہنے سہنے کے ساتھ ساتھ اِس چیز کی بڑی اہمیت ہے کہ معاشرے میں ہر رکن یہ سمجھے کہ وہ ایک جماعت سے تعلق رکھتا ہے اور وہ اپنی رکنیت کے حصول کے لیے کوشش کرے۔ اِسی احساس سے انسانی جماعت میں انسانیت پیدا ہوتی ہے۔ ناول میں وہ پیغام بہت اہمیت رکھتا ہے، جو مصنف امتل کے ذریعے اِن الفاظ میں پیش کرتا ہے:

> ''دُنیا میں ایک ایسا نقطہء نگاہ رائج کرنا چاہیے جو محض انسانی ہو۔ اُس کے وجود کی منطق یہ ہو کہ وہ انسان کو انسان سے ورثے میں ملا ہے۔''[۲۵]

امتل جس فکر کی علامت بنتی ہے، وہ مُصر ہے کہ ایک اخلاقی نظام، جو اخلاقی تصورات پر مبنی ہو، غلط بھی ہو سکتا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ رائج اخلاق، غلط اخلاق ثابت ہو۔ مادی اجسام مشینوں کی طرح حرکت کرتے ہیں۔ وہ ایک سے حالات میں ہمیشہ ایک سی حرکتیں کرتے ہیں۔ مادی فطرت کا خود رو اظہار، وہ آزادی ہے جو قانون کی اطاعت کرنے سے اُسے نصیب ہوتی ہے۔ آزادی کے اِس تصوّر کو انسانوں کے اسالیبِ حیات پر مڑھ دینا غلط ہے، کیونکہ انسان کے لیے حقیقی طور پر سوچنے اور محسوس کرنے اور اُسی کے مطابق عمل پیرا ہونے کی صلاحیت کا نام انسانی فطرت ہے۔ زندگی فارمولوں اور قوانین کے ذریعے منظّم ہو کر مشینی ہو جاتی ہے۔ اُس میں سب سے کم جو چیز نظر آتی ہے، وہ انسانیت ہوتی ہے۔ اِسی لیے امتل اِس انتہا تک چلی جاتی ہے:

> ''زندگی کو بنجارے کے نقطہء نظر سے دیکھنا چاہیے۔ بنجارے کی کوئی نسل نہیں ہوتی۔ وہ ہر تہذیب کا فرد ہے، ہر سماج کا آدرش ہے، ہر صدی کی سچائی ہے، وہ جغرافیے کے ہر خط کو کاٹتا ہے اور کوئی اُس سے باز پرس نہیں کرتا، پرندے کی طرح ہر سرحد پار کر جاتا ہے۔''[۲۶]

فن کار کسی ایک احساس یا جذبے کی شدت سے مغلوب ہونے کی بجائے معروضیت، علیحدگی، غیر جانب داری اور لاتعلقی کی راہ سے حقائق کی عکاسی کی کوشش کرتا ہے۔ بیانیہ دُنیا کو وہ ہیئت عطا کرتا ہے جو فطری طور پر اُس میں سے ابھرتی ہوئی محسوس ہو۔ یہ وہ ہنر ہے جس کے ذریعے کہانی کار واقعات کو ایک خاص ترتیب دیتا ہے اور اُس سے اپنے طور پر کوئی معنویت تجویز کرتا ہے۔ رحیم گل نے امتل کے کردار کو متوازن بنانے کے لیے کہانی کے بیان کار وسیم کا کردار بڑی احتیاط سے کہانی کا حصہ بنایا ہے۔ یہ ایک میانہ رو، چیزوں کو تجزیاتی انداز میں دیکھنے والا، واقعیت پسند کردار ہے، جو امتل کے کرداری خصائص کی بنیاد پر اُس کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ کہانی کو فطری انداز میں آگے بڑھانے میں اِس کا عمل دخل بہت زیادہ ہے۔ اُس کا زاویہء نظر ایک نارمل گوشت پوست کے انسان کی ترجمانی کرتا ہے:

''دُنیا چاہے نامکمل ہی ہو، لیکن دُنیا میں ایک چیز مکمل ہوتی ہے اور وہ ہوتا ہے جوان
عورت کا جسم۔'' ۶۷

وسیم کے وسیلے سے کیا جانے والا انسان کی جذباتی حقیقت کا یہ اثبات انگریزی شاعر ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس کی مشہور نظم ''POLITICS'' کی یاد دلاتا ہے، جس کے شروع میں جرمن ناول نگار تھوماس من کا یہ حکیمانہ قول ''ہمارے عہد میں انسانی تقدیر اپنے معانی سیاسی اصطلاحوں میں آشکار کرتی ہے۔'' درج کرتے ہوئے، جوانی اور محبت کو عالمی سیاست سے زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ یہ کسی نوجوان کا جذباتی اُبال نہیں، ایک بہت بڑے اور عمر رسیدہ شاعر کا جنگِ عظیم دوّم کے خطرات کے باوجود انسان کے جذباتی وجود کا شدید احساس ہے، جو کہتا ہے سیلانی اور سیاسی آدمیوں کا کہا بجا درست سہی، مگر کاش میں جوان ہوتا اور اُس لڑکی کو اپنی آغوش میں لے سکتا۔ وسیم جو امتل کی شخصیت اور خیالات کی وجہ سے دباؤ کا شکار نظر آتا ہے، امتل کی اس بے ضرر اور معمولی سی حوصلہ افزائی سے کہ، جب وہ اُسے بتاتی ہے کہ وہ نہیں چاہتی کہ وسیم تہی دامن رہ جائے، بل کہ وہ چاہتی ہے، وسیم اٹل ہو جائے، مضبوط بن جائے، جس پر وسیم رفعت کے اُس احساس کو پالیتا ہے، انسانی نفسیات کے حوالے سے جس کی نشان دہی ممتاز امریکی ماہرِ نفسیات ابراہم میسلو نے کی ہے۔

تقدیس کے جذبات سے خالص جسمانی محبت کے احساس تک کا وسیم کی محبت کا سفر بھی بہت دل چسپ ہے۔ جو امتل کو حاصل بھی کرنا چاہتا ہے اور اُس میں اپنے اندر کے والہانہ پن اور بے ساختگی کا بھی آرزومند ہے۔ اُس کے آدمیت کے تصوّر میں بھی ایک والہانہ پن ملتا ہے، جس کی طرف ییٹس کی محولہ بالا نظم میں اشارہ کیا گیا ہے:

''مُلک ہار جائے، تو کچھ نہیں ہارتا، آدمی ہار جائے، کچھ نہیں مرتا، انسان کی اُمنگ ماردی جائے، تو
سب کچھ مر جاتا ہے۔'' ۶۸

رحیم گل نے اپنے اس معنی خیز تخلیقی تجربے میں جو گونا گوں تہذیبی اور فکری مباحث چھیڑے ہیں، ضروری نہیں اُن سب سے پڑھنے والوں کو اتفاق ہو۔ بعض مقامات پر اختلاف کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ امتل کا چینی سیاح کو یہ کہنا تو سمجھ آتا ہے کہ یورپ کی میکانکی زندگی، مشرقی روحانیت سے ہمیشہ مرعوب رہی ہے۔ شہری زندگی کے کرب اور صنعتی دور کی ناآسودگی نے اہلِ مغرب کو مشین کا ایک پرزہ بنا دیا ہے۔ سو وہ اِس صورتِ حال سے گھبرا کر مشرق کی طرف دوڑتے ہیں۔ یہاں تمھیں اُس جوگی کی تلاش ہوتی ہے جو ننگ دھڑنگ برفانی راتوں کا مقابلہ محض اپنی شکتی سے کرتا ہے۔ دراصل تم اپنی ذات کی تلاش میں ہوتے ہو۔ اس ذات کی تلاش میں، جسے تم غار میں چھوڑ آئے ہو۔ ہیرمان ہیسے سے ڈبلیو۔ بی۔ ییٹس تک بہت بڑے بڑے یورپی عبقریوں کے ہاں اِس طرح کے مسائل ملتے ہیں، مگر یہ کہنا کہ انسان جب زمین پر پہنچایا گیا تو کوئی مذہب نہیں تھا۔ کسی اخلاقی اور تمدنی سوچ نے جنم نہیں لیا تھا۔ صدیاں بیت گئیں۔ آہستہ آہستہ خدا کا تصوّر اور الہامی دور آیا۔ یہ ایک غیر محتاط مغربی نظریہ ہے۔ مشرق مخصوصاً اسلامی روایات سے اِس کی تائید نہیں ہوتی۔ اِسی طرح یہ کہنا بھی درست نہیں کہ انسان کو ہمیشہ پناہ کا احساس ستاتا رہا ہے اور مذہب بھی ایک جذباتی پناہ گاہ ہے، جس میں ہر دور کے انسان نے پناہ لی ہے، بس اِن پناہ گاہوں کے گنبدوں کی شکلیں بدلتی رہی ہیں۔ یا یہ کہ قدرت کے قانون ناقابلِ فہم ہیں اور ہماری سمجھ میں نہیں آتے، اِس لیے ہم خدا کے تصوّر میں پناہ لیتے اور اپنے من کی ڈھارس بندھاتے ہیں۔

کچھ ایسے ہی مسائل کی وجہ سے رحیم گل کے ہاں مذہب کا تصوّر ایک پناہ گاہ تک محدود ہو جاتا ہے۔ انگریز سیاح کا قصّہ جو ایک شادی شدہ جوان بیٹی اور دو شادی شدہ جوان بیٹوں کا باپ ہوتے ہوئے یوں کس مپرسی کی موت مر جاتا ہے۔ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق وہ پیاس بجھانے کے لیے تپائی سے تھرماس لینے کی کوشش میں پلنگ سے گر پڑا تھا، لیکن جسم میں طاقت نہیں تھی کہ دوبارہ اٹھتا۔ لہٰذا وہیں فرش پر دو دن دو راتیں مسلسل تڑپتا رہا اور دم توڑ دیا۔ بیٹا اپنی صحت اور خوش پوشی کے لیے مشہور اور خوب صورت باپ کا کھلا منہ، کھلی آنکھیں اور اکڑا ہوا جسم دیکھ کر سکتے میں چلا جاتا ہے، یہاں تک تو بات سمجھ میں آتی ہے، مگر اِس سانحے سے جو نتائج اخذ کیے گئے ہیں، وہ روایتی قسم کے ہیں، جس میں پاکستانی یورپ کو رشتوں کے احساس سے عاری معاشرہ تصوّر کرتے ہیں۔

خاندان کا ادارہ صرف مغرب میں ہی نہیں، مشرق میں بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہے۔ مجید امجد اپنے عہد کے ممتاز شاعر اور ایک سرکاری افسر تھے۔ ساہی وال ایسے چھوٹے سے شہر میں جن حالات میں اُن کی موت ہوئی، وہ سیّاح کے باپ والے قصّے سے ملتا جلتا واقعہ ہے، مگر اِس ایک واقعے کی بنیاد پر پورے پاکستانی معاشرے میں خاندان کے ادارے کو مطعون کرنا مناسب نہ ہوگا۔ ہر چند کہ یہاں مغرب کی نسبت ریاست کا افراد سے رشتہ بے حد کم زور ہے۔

> ''اگر ہم انسان ہوتے اور ہمارا احساس زندہ ہوتا تو وہ نہایت تسلّی سے کسی بیٹے کے گھر مر سکتا تھا۔ اُسے کم از کم یہ اطمینان تو ہوتا کہ اِس بھری دنیا میں اُس کا بھی کوئی ہے اور وہ اپنے پیاروں کے درمیان مر رہا ہے، جو عزّت اور احترام سے اُس کا جنازہ اُٹھائیں گے اور اس کے لیے آنسو بہائیں گے۔'' ۲۹

صاف جھلکتا ہے کہ یہ خیالات کسی انگریز کے نہیں، ایک مخصوص پاکستانی ذہنیت کا اظہار ہیں۔ جس کا اظہار کہانی کے شروع میں ایک بوڑھوں کے ہوسٹل میں رہنے والی امریکی خاتون کے ضمن میں بھی ہو چکا ہے، لیکن وہاں امتل نے ایک بڑی حقیقت پسندانہ بات کہی تھی:

> ''مشرق محض روایتی طور پر کنبے کا قائل ہے۔ ورنہ ہماری سرشت بھی مغرب والوں سے مختلف نہیں۔'' ۳۰
>
> ''یورپ والوں کا مسئلہ یہ ہے کہ اُنہیں جمہوریت کی وجہ سے مکان، کپڑا، روٹی اور جنس ہر چیز میسر آ گئی۔ سکھ اور آسایش کی بہتات نے اُنہیں تھکا دیا ہے۔ ایک وقت آتا ہے کہ کثرتِ آسودگی بھی نفسیاتی بیماری بن جاتی ہے۔'' ۳۱
>
> ''عورت کا طلسم بہت جلد ٹوٹ جاتا ہے۔ جس طرح ایک خوب صورت منظر کو ایک بار دیکھنے کے بعد انسان آگے سفر شروع کر دیتا ہے۔'' ۳۲

محولہ بالا اقتباسات میں سامنے آنے والے خیالات کے ضمن میں یہ عرض کیا جا سکتا ہے کہ محبت انسان کے جذبات کا سب سے مؤثر اظہار ہوتا ہے۔ انسان اپنے جذبات میں جس قدر حقیقی ہوتا ہے، اُس کا اظہار اُسی قدر مؤثر ہوتا ہے۔ جذبہ وہ شے ہے جو انسان کو چیزوں کی قدر و قیمت سمجھنے کے قابل بناتا ہے۔ انسان فکر کے بجائے اچھائی اور برائی، خوب صورتی اور بدصورتی کی قدر اور اہمیت جذبے کے ذریعے ہی پہچاننے کی کوشش کرتا ہے۔ اطمینان اور بے اطمینانی کا فرق بھی جذبے کا محتاج ہوتا ہے۔ سو انسان کے لیے بعض حوالوں سے جذبہ فکر سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ جذبہ انسان کے شعور کی تشکیل کرتا ہے، کیوں کہ انسان جو محسوس کرتا ہے اور جس طرح محسوس کرتا ہے، اُسے، انسان کیا ہے اور وہ کس طرح سوچتا ہے، پر ترجیح حاصل ہو جاتی ہے۔ انسانی زندگی میں اہم ترین عوامل کی نوعیت بھی فکری سے زیادہ

جذباتی ہوتی ہے۔

سائنسی افکار کے ذریعے مظاہرِ فطرت کی تسخیر تو ممکن ہے، مگر اس عمل سے انسان کی خوشیوں میں اضافہ کرنا ہے یا انسانی خوشیوں کو خراب کرنا ہے، اِس کا فیصلہ جذبات ہی سے ممکن ہے۔ جذبات کو عقل سے کم تر خیال کرنا مناسب نہیں۔ جذبات کو عقل سے ادنیٰ سمجھے جانے کی ایک وجہ جذباتی تربیت کا نہ ہونا بھی ہے۔ قابلِ غور امر یہ ہے کہ انسان کسی کام کو فرض سمجھ کر اُسی وقت کرتا ہے، جب وہ سوچتا ہے کہ یہ کام فائدہ مند رہے گا، مگر وہ یہ محسوس نہیں کرتا کہ یہ کام اُس کے لیے فائدہ مند ہے، تو اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ اُس کا جذبہ غلط ہے یا پھر فکر، یہ بھی ممکن ہے کہ فکر غلط اور جذبہ درست ہو۔ گویا ایسے معاملوں میں اچھائی، برائی کے تعین کے لیے جن اُصولوں کا سہارا لیا جاتا ہے، وہ درحقیقت دوسروں کے روایتی جذبات ہوتے ہیں، کیوں کہ ایسی صورت میں انسان کو اپنے جذبات پر اعتماد نہیں ہوتا۔ اِس کا واحد علاج یہ ہے کہ انسان مناسب ڈھب سے محسوس کرنا سیکھے۔ جس طرح انسان کی فکر غلط ہو سکتی ہے، بالکل اُسی طرح اُس کے جذبات بھی غلط ہو سکتے ہیں۔ جو اُسے دھوکا دے کر اُس کے تجربے میں غیر حقیقت کو نامحسوس انداز میں داخل کر دیتے ہیں۔ امثل کا جذباتی سچائیوں کو خون کا ابال قرار دینا اور یہ خیال کرنا کہ جب خوب صورت آنکھوں کے سرخ ڈورے اور حسین جسم کا تناسب ختم ہو جاتا ہے، تو جذباتی سچائیاں بھی جھاگ کی طرح بیٹھ جاتی ہیں، اِس اعتبار سے انسانی تجربے کا درست ادراک ہو سکتا ہے۔ حقیقت میں صرف وہی چیزیں انسان کے لیے مفید ہوتی ہیں، جن کا فائدہ مند ہونا محض خیالی نہ ہو، بل کہ واقعی احساس رکھتا ہو۔ جذبے کی بجائے فکر کا سہارا ایک حتمی انتخاب ہے یا نہیں؟ اِس بارے میں فیصلہ آسان نہیں ہوتا۔ ایسے امور جن پر انسان کو ندامت محسوس کرنی چاہیے، مگر وہ اُن پر فخر محسوس کر رہا ہو، جو یہ ثابت کرتا ہے کہ انسان کے جذبات حقیقی ہی نہیں غیر حقیقی بھی ہو سکتے ہیں۔ انسان اپنے جذبات کے تئیں نہ صرف غلط فہمیوں میں مبتلا ہو سکتا ہے، بل کہ وہ اپنے جذبات سے ناواقف بھی ہو سکتا ہے۔ بعض اوقات انسان اپنے حقیقی جذبات کا سامنا کرنے سے کتراتا ہے۔ امثل کا یہ کہنا کہ انسان جب پہلی بار محبت میں مبتلا ہوتا ہے تو محبوب کی ایک جھلک کے لیے پہروں کھڑا رہ سکتا ہے۔ پھر اُس کے بوسے کی خواہش تڑپاتی ہے، جب اُسے یہ بھی میسر آ جاتا ہے، تو پھر مہینوں اُس پر مدہوشی اور سرشاری کا عالم طاری رہتا ہے۔ پھر دھیرے دھیرے وہ تڑپ، وہ کپکپی، وہ گدگدی، وہ گرمی، وہ تشنگی اور وہ لرزا دینے والی کیفیت اپنی گرفت ڈھیلی کرتی چلی جاتی ہے۔ آخر میں کچھ بھی باقی نہیں رہتا، یہ درحقیقت حقیقی جذبات کی ایک جہت جسے بدنی جہت کہہ سکتے ہیں، اُس کے دوام سے انکار ہو تو بجا ہے، لیکن جذبات کی اہمیت سے مکمل طور پر منکر ہو جانا ایک طرح کی انتہا پسندی ہوتی ہے۔ اگر یہاں متکلم کا کہنا یہ ہو کہ انسانی جذبات خارجی حقایق سے اپنا تعلق منقطع کرنے پر غیر حقیقی جذبات کی ایسی ہی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایسے جذبات کا حامل شخص جذباتیت کا شکار ہو جاتا ہے، تو یہ ایک درست بات ہوگی۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ محبت اور حسن کا تعلق انسانی احساس سے وابستہ ہوتا ہے، نہ کہ وقت سے۔ انسانی رشتے زندگی کا جوہر اور احساس کا اعلیٰ ترین اظہار ہوتے ہیں اور وہ اتنے کم زور نہیں ہو سکتے

ناول میں وسیم جس طرح جرمنوں جاپانیوں اور ہندوؤں کی ممتاز نسلی خصوصیات کو بیان کرتا ہے۔ اِن باتوں پر فرانسیسی فلسفی جوزف آرتھر کومتے دے گوبیناؤ کے اثرات ملتے ہیں۔ جس نے اُنیسویں صدی میں پیش کیے جانے والے انسانی نسلوں کی نابرابری کے قابلِ اعتراض نظریے میں کہا تھا کہ انسانوں کی جسمانی ساخت، ذہنی استعداد اور کرداری خصوصیات کے خلقی اختلافات رکھنے والی کئی جداگانہ نسلیں ہیں۔ جن میں آریا نسل قدرتی طور پر باقی سب نسلوں سے برتر ہے۔ جو اصل میں یہ سفید فام اقوام کی دیگر انسانوں پر نسلی برتری کا اعلان

تھا۔جدید حیاتیاتی علوم ایسے تمام متعصّبانہ نظریات کو غلط ثابت کر رہے ہیں۔انسانی صفات کو کسی خاص نسل یا قوم سے منسوب کرنا اب قابلِ قبول نظریہ نہیں رہا۔ہر ذی حیات اور نامیاتی جسم کا ایک ماحول ہوتا ہے جو اُسے اُکساتا ہے،جس سے اُس کا طرزِ عمل خود کو ماحول کے مطابق بنانے کی کوشش کرتا ہے۔یوں نامیاتی جسم کی مخصوص بالیدگی وجود میں آتی ہے اور وہ ایک طے شدہ راستے پر چلتا رہتا ہے۔زندگی کی ایک ترسیل ہے جو نسلوں کو ایک دوسرے سے ملاتی ہے۔اِس ترسیل میں تمام ذی حیات ایک پیچیدہ ماحول سے مطابقت پیدا کرنے کے لیے مسلسل کوشش کے ذریعے تغیر اور نشو ونما کی مختلف منازل طے کرتے ہیں۔جسے ارتقاء بھی کہا جا سکتا ہے۔

''دولت کی خواہش شعوری ہے۔ذہانت روپے کی خواہش کرتی ہے۔کند ذہن آدمی روپیہ پیدا نہیں کر سکتا،لیکن وہ زندگی گزار سکتا ہے،جس طرح اس جھونپڑے کے لوگ۔'' ۳۳

یہ انسانی طبیعتوں کا عمیق مطالعہ نہیں مانا جا سکتا ہے۔اوّل تو خود ذہانت ایک غیر واضح معاملہ ہے۔دوّم دولت کمانے کے کوئی مسلمہ یا طے شدہ اُصول نہیں ہیں۔اِس میں ماحول اور حالات غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔دولت کی خواہش شعوری سے زیادہ ماحولی اور فطری ہوتی ہے۔دولت کمانے میں ذہانت کا بہت زیادہ عمل دخل ہوتا تو پھر دنیا کے بڑے بڑے سائنس دان،فلسفی،دانش ور اور مدبّر امیر ترین لوگوں میں شامل ہونے چاہئیں تھے۔زندگی کی بعض جہات اِس فن پارے کی گرفت میں نہیں آ سکیں،جیسے ترقی پسند فکر،جس سے بیسوی صدی میں دنیا کا اقتصادی،سیاسی اور سماجی نظام بہت زیادہ متاثر ہوا۔جس سے دُنیا کا نقشہ بدلا،چین اور روس ایسے بڑے ملکوں میں جس کے عملی نفاذ کے بہت بڑے تجربے سامنے آئے۔جو اشتراکی فکر انسان دشمن سرمایہ دارانہ نظام کو سماجی جمہوریت تک لانے میں کام یاب رہی۔جس کی طاقت کا بڑی حد تک انحصار اس بات پر رہا ہے کہ اس معاشرتی تصوّر کا قومیت کے کسی اصول سے نہیں۔وہ ایک عالمی اتحاد کی نظریاتی بنیاد فراہم کرنے کی ایسی کوشش تھی۔جس میں تہذیب اقتصادی بنیادوں پر انحصار کرتی ہے۔آج اکیسویں صدی میں بھی اَن گنت مفکر،دانش ور،فن کار،سیاسی اور سماجی کردار جس فکر کے قائل ہیں،اُس کے تئیں اس طرح کے تجزیات بہت سرسری اور سطحی معلوم ہوتے ہیں:

''میرؔ کم شاعر نہیں تھا،مگر غالبؔ جیسی قوتِ احساس سے محروم تھا،جذبے کے بغیر کوہ کن پیدا نہیں ہوتے،مگر تعلیم کے بغیر شیکسپیئر پیدا ہو جاتے ہیں۔قدرت خود درجہ بندی کرتی ہے۔خود عرفان سے نوازتی ہے،اِس لیے اگر ہم وہ نہیں ہیں،جو بننے کی آرزو رکھتے ہیں،تو کوئی مضائقہ نہیں۔'' ۳۴

تین بہت بڑے تخلیق کاروں کی مثالیں دے کر کیا کہنے کی کوشش کی گئی ہے،یہاں کچھ مفہوم نہیں ہو رہا۔یہ کہنا کہ میرؔ،غالبؔ جیسی قوتِ احساس سے محروم تھے،ایک طرح کی بدذوقی اور بے خبری ہے۔میر کے ہاں،جذبے کی جو شدّت ملتی ہے،اُس کو سامنے رکھتے ہوئے،ایسی رائے دینا ایک مہمل بات ہے۔ایسی چند کم زوریوں کے باوجود بحیثیتِ مجموعی یہ ناول توانا تہذیبی و فکری مباحث،ایک مختلف قسم کے بیانیے،سماجی تجربوں کے انعکاس اور زندہ و پایندہ پاکستانیت کے بل بوتے پر ایک مؤثر اور قابلِ قدر فن پارہ کہلانے کا مستحق ہے۔معنی خیز کتاب کا ایک وصف یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف پہلے چھپنے والی کتب،بل کہ بعد میں آنے والی کتابوں کو بھی اپنے قاری کے لیے تقابلی معنویت سے آراستہ کرتی ہے۔۲۰۰۶ء میں چھپنے والی،معروف پاکستان نژاد برطانوی دانش ور پروفیسر ضیاء الدین سردار کے مشاہدات،خیالات اور یادداشتوں پر مبنی بہت اہم انگریزی خودنوشت،جس کا ''جنت کے لیے سرگرداں'' کے عنوان سے معروف افسانہ نگار اور صحافی مسعود اشعر نے

۲۰۰۹ء میں اُردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ فکرانگیز خودنوشت آج کے دور کے ایک مسلمان کی شناخت کے حوالے سے اُٹھائے جانے والے سوالات کی وجہ سے بار بار ’’جنت کی تلاش‘‘ کی طرف توجہ مبذول کراتی ہے۔

> ’’خواب اور حقیقت ہمیشہ ہی ایک دوسرے سے الگ نہیں رہتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ آپ حقیقت کی ایسی دنیا میں پہنچ جاتے ہیں۔ جو خواب جیسی ہوتی ہے اور آپ کو محسوس ہوتا ہے کہ دونوں ایک باریک سا رشتہ موجود ہے۔‘‘ ۳۵؎

میلان کندیرا کے مطابق ناول میں بصیرت سوال اُٹھانے سے پیدا ہوتی ہے۔ ’’جنت کی تلاش‘‘ میں سلیقے اور قرینے سے اَن گنت سوال اُٹھائے گئے ہیں اور بیانیے کا تفاعل بھی متاثر نہیں ہوا۔ کندیرا نے علم کو ناول کی اخلاقیات کہا ہے۔ کُندیرا کے تئیں ناول جاننے کے جذبے سے جنم لیتا ہے اور وہ ناول جو علم میں اضافہ نہیں کرتا، بے کار ہے اور جلد ہی ختم ہو جانے والا ہوتا ہے۔ ’’جنت کی تلاش‘‘ کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ کندیرا کی اِس کڑی شرط کو بڑی خوش اُسلوبی سے پورا کرتا ہے۔ کٹھن کے ایک اور بڑے ناقد میخائل باختن کی ناول پر نافذ کی گئی ایک اہم شرط کہ ناول کو ایک آواز کی بجائے کئی آوازوں پر مشتمل ہونا چاہیے، اِس ناول میں بخوبی پوری ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ آج جب پاکستان کے وجود کے متعلق طرح طرح کے شکوک وشبہات کا اظہار کیا جارہا ہے، ایسے حالات میں ایک ناول نگار اگر وطن کی حقیقی صورتِ احوال کو فن کارانہ مہارت سے سامنے لاتا ہے۔ جس سے اِس ملک کے لیے قاری کے دل میں رجائیت اور دل چسپی پیدا ہوتی ہے، تو یہ ایک ایسا کارنامہ ہے، جس کو نظرانداز نہیں کیا جانا چاہیے۔ رحیم گل نے پاکستان کی تہذیبی اور فکری جہات کو دایمی انسانی اقدار کے تناظر میں پیش کرنے کی جو قابلِ توجہ کاوش کی ہے، یہ مقالہ اُسے سمجھنے اور واضح کرنے کی ایک کوشش ہے۔

حوالہ جات

۱۔ رحیم گل ’’جنگ کی تلاش‘‘ رابعہ بک ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۸ء، صفحہ ۴۵۸

۲۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۲۵۸

۳۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۲۵۸

۴۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۲۷۸

۵۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۲۷۹

۶۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۳۱۱

۷۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۲۵۴

۸۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۲۶۴۔۲۶۳

۹۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۴۸۔۴۷

۱۰۔ میرزا ادیب، رحیم گل، مشمولہ از کاروافکار، مکتبہ میری لائبریری، لاہور، ۱۹۸۸ء صفحہ نمبر ۴۱۰

۱۱۔ رحیم گل، جنّت کی تلاش، حوالہ مذکور، صفحہ نمبر ۴۸۔۴۷

۱۲۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۲۰۴

۱۳۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۳۲

۱۴۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۱۱۵

۱۵۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۱۲۷

۱۶۔ ڈاکٹر سلیم اختر، اُردو کی مختصر ترین تاریخ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء، صفحہ نمبر ۵۰۰

۱۷۔ رحیم گل، حوالہ مذکور، جنّت کی تلاش، صفحہ نمبر ۳۹۲

۱۸۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۴۰۴

۱۹۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۴۰۹

۲۰۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۱۴۴

۲۱۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۶ ۷

۲۲۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۷۷

۲۳۔ احسان اکبر، حوالہ مذکور، نمبر ۸۱۶

۲۴۔ ڈاکٹر اے۔ بی۔ اشرف، مسائلِ ادب؛ تنقید و تجزیہ، سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۹۵ء، صفحہ نمبر ۳۴۷

۲۵۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۲۹۵

۲۶۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۴۰۵

۲۷۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۲۴

۲۸۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۳۸۷

۲۹۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۳۰۰

۳۰۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۵۴

۳۱۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۳۰۲

۳۳۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۱۵۳

۳۴۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۲۵۰۔۲۴۹

۳۴۔ ایضاً، صفحہ نمبر ۳۱۴

۳۵۔ ضیاالدین سردار، جنت کے لیے سرگرداں، (ترجمہ مسعود اشعر)، شہرزاد، کراچی، ۲۰۱۱ء دوسری اشاعت، صفحہ نمبر ۱۱۱